پیام اقبال Bahria Research Journal on Iqbal Studies (BRJIS)
2(1), 21-35, 2023

تعمیر شخصیت میں خودی کا بنیادی کردار

Role of Khudi in Personality Development

Rozina Anjum Naqvi
Islamia University Bahawalpur
r.anjum@outlook.com

Abstract

The 19th Century brought shackles of slavery on the Muslims of subcontinent. Muslims lost their identity and were in the slumber of negligence. At that time, it was necessary, an intellectual should wake them up and give them personal and national identity by reminding them their glorious past. So Allama Iqbal breathed new life into the dead nation through his unique message in Persian and Urdu languages. This message not only built the personality, but on its basis a new nation-state came into existence. This article discusses the fundamental role of Allama Iqbal's philosophy of selfhood (*Khudi*) and how it plays role in personality development. adopted into modern requirements of present.

Keywords: Iqbal, personality development, *Asrar e Khudi*, Khudi, selfhood, philosophy

کلیدی الفاظ: اقبال، شخصیت، خودی، معرفت نفس، خود شناسی

انیسویں صدی برصغیر کے مسلمانوں پر طوق غلامی لے کر نمودار ہوئی۔ انگریز جو برصغیر کو سونے کی چڑیا سمجھتے تھے، یہاں لوٹنے کی غرض سے آئے۔ جب کہ مسلمانان پاک و ہند اپنے ذاتی اور قومی تشخص کو بھول کر قعر مذلت کی عمیق گہرائیوں میں پڑے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ اور اپنی شناخت کھو دینے کے بعد غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان کو معرفت نفس اور اپنی ذات کا ادراک دلایا جائے تا کہ وہ اپنے تابناک ماضی کی لازوال کرنوں سے روشنی لے کر سوئے حرم گامزن ہوں۔

ان ناگفتہ بہ حالات میں ایک قد آور شخصیت، نابغہ روزگار اور ایک عظیم فلسفی ڈاکٹر محمد اقبال نبض شناس کی مانند آگے بڑھے اور اپنے سحر آفرین فلسفہ خودی سے مردہ قوم کی سر درگوں میں زندگی کی حرارت پھونک دی علامہ اقبال کے فکر و فن کا یہ اظہار فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ہوا۔ یہی وہ ذاتی اور قومی تشخص تھا جس نے نہ صرف تعمیر شخصیت کی بلکہ جس کی بنیاد پر ایک نئی اور عظیم مملکت پاکستان جریدہ عالم پر نمودار ہوئی۔ زیر نظر مقالہ میں تعمیر شخصیت میں علامہ اقبال کے بنیادی اور شہرہ آفاق فلسفہ خودی کے بنیادی کردار پر بحث کی گئی ہے اور عصر حاضر کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال شاعر مشرق کا کلام بے وجہ نہیں اور نہ ہی یہ عشق و عاشقی کی داستان پر مبنی ہے بلکہ ایک خاص نصب العین کا حامل ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ اس کی ہر دور میں اہمیت مسلّم ہے، اس لئے کہ یہ آگہی، خود شناسی اور تشکیل فرد پر مشتمل ہے کیونکہ فرد ہی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک جماعت اور مضبوط قوم کی بنیاد رکھتا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ؛

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز
بناخن سینہ کاویدن بیاموز
اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز(۱)

ترجمہ۔ آ اور اپنے آپ سے لپٹنا سیکھ۔ اپنے ناخن سے سینہ کو کریدنا سیکھ۔ اگر تو خدا کو آشکارا دیکھنا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو آشکارا دیکھنا سیکھ) مراد اپنی طرف توجہ دے اپنی معرفت کر۔

ارشاد ربانی ہے: لقد خلقنا الانسان فی احسن التقویم (القرآن، سورہ والتین،۴)، مراد بے شک ہم نے انسان کو بہترین تخلیق میں پیدا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبیؑ، رسولؐ، امام، ولی اور مصلح نے تشکیل فرد پر زور دیا ہے تا کہ فرد کی شخصیت کامل ہو کر کارآمد ثابت ہو سکے۔ قدرت نے یہ کام مختلف ادوار میں اپنے منتخب نمائندوں کو تفویض کیا جن کا نام جریدہ عالم پر ثبت ہے۔ انیسویں صدی جب برصغیر کے مسلمان ظلم وجور کی چکی میں پس رہے تھے تو ایسے میں عظیم مفکر علامہ اقبال نے شخصیت انسانی کے نکھار کے لئے پیغام خودی دیا اور اس کو اپنے نظام فکر میں بنیادی حیثیت دی ہے۔ علامہ اقبال کے اس فلسفہ کی ابتدائی جھلک یوں دکھائی دیتی ہے کہ؛" شخصیت انسان کا عزیز ترین سرمایہ ہے، خوب ہے وہ جو شخصیت کے احساس کو بیدار رکھے اور ناخوب وہ ہے جو شخصیت کو دبائے اور بالآخر اسے ختم کر دینے کی طرف مائل ہو۔"(۲) شخصیت کی جگہ اگر خودی کا لفظ لگا دیں تو مفہوم واضح ہو گا۔ لہٰذا لازم ہے کہ معنیٔ خودی سے آگہی ہو۔ خودی سے مراد غرور و تکبر یا کبر و ناز نہیں جیسا کہ اردو فارسی کی لغت میں درج ہے بلکہ علامہ اقبال کی نظر میں خودی بمعنی شناخت، معرفت نفس اور تعین ذات ہے جیسا کہ خود اس کی وضاحت کی ہے کہ؛

> یہ خودی یا انا یا میں جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت نگاہوں کے گرم مشاہدے کی تاب نہیں لا سکتی۔ کیا چیز ہے کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنے فوری عملی اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ گوئی آمیز مصلحت میں نمایاں کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ گویا اس کے نزدیک خودی ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال بنائی جا سکتی ہے۔(۳)

خودی، جس کو علامہ اقبال نے "خویشتن دار و خویشتن باز و خویشتن ساز" (اپنی حفاظت، اپنا اظہار اور اپنی تعمیر) کے نام سے تعبیر کیا۔ کہتے ہیں کہ "خودی ایک 'وحدت وجدانی' یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں' یہ ایک لازوال حقیقت ہے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔"(۴)

گویا انسانی شعور ایک وحدت ہے اور یہی انسان ہے جیسا کہ خود فرماتے ہیں کہ :

از خود اندیش و ازین بادیہ ترساں مگذر
کہ تو ہستی و وجود دو جہاں چیزی نیست(۵)

ترجمہ: اپنے بارے میں سوچ اور اس خوف کی وادی سے گذر جا۔ کیونکہ تیرے وجود کے آگے دو جہان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک تمام نظام عالم کی بنیاد خودی پر ہے۔ اور تمام مظاہر کائنات میں خودی نمایاں ہے۔ بلکہ یہ سب خودی کی ہمہ گیر قوت کے آئینہ دار ہیں۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چون خودی بیدار کرد
آشکارا عالم پندار کرد(۶)

ترجمہ۔ عالم موجودات خودی کے آثار سے ہے۔ تو جو کچھ دیکھتا ہے وہ خودی کے اسرار سے ہے۔ جب خودی نے اپنے آپ کو بیدار کیا تو کائنات وجود میں آگئی۔

علامہ اقبال کے نزدیک اپنے آپ کو ظاہر اور نمایاں کرنا خودی کی فطرت ہے۔ وہ کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہے اور اپنے اظہار کے لئے بیقرار ہے تا کہ اس کی شناخت ہو اور مختلف کیفیات اور اعمال اسی کے اظہار کی عکاس ہیں، باغات میں گلکاری اور رات اور دن کا بدلنا اسی کا مرہون منت ہے۔ گویا ساری کائنات اسی کی عمل گاہ ہے۔ لہٰذا خودی جتنی مضبوط ہو گی، زندگی اتنی ہی پائیدار ہو گی۔ جیسا کہ اپنے اردو کلام میں کہتے ہیں کہ؛

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی(۷)

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت می شود پاینده تر
زنده تر، سوزنده تر، تابنده تر (۸)

ترجمہ: ایک نور کا نقطہ جس کا نام خودی ہے۔ ہماری خاک کے نیچے زندگی کی چنگاری ہے۔ محبت سے یہ زیادہ پائندہ، زیادہ زندہ، زیادہ جلانے والی اور زیادہ چمک دار ہو جاتی ہے۔

علامہ کے نزدیک نفیِ خودی مغلوب قوموں کی ایجاد ہے، اس لئے کہ نفی خودی بزدلی، کاہلی اور سستی کو جنم دیتی ہے اور جب کسی قوم میں یہ سستی اور کاہلی غالب آجائے، تو افراد کے اندر عزم واستقلال کا فقدان ہو جاتا ہے اور وہ سعی و عمل کو چھوڑ کر طاؤس ورباب کی محفل میں مصروف ہو جاتا ہے تو پستی اور زوال اس قوم کا مقدر بن جاتا ہے اور یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی شناخت کھو بیٹھتی ہے۔ جب کہ، علامہ اقبال کا فلسفہء خودی ایک حرکی اور عملی نظریہ ہے جو تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جیسا کہ کہتے ہیں کہ:

خدائے لم یزل کا دستِ قُدرت تُو، زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گُماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تُو، جاوداں تو ہے (۹)

یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال افلاطون کے نظریہ سے اتفاق نہ کر سکے۔ ان کے نزدیک افلاطون کے افکار قوت عمل اور طاقت سے محرومی کے حامی ہیں بلکہ اس کے خیال میں عالم اسباب محض ایک موہوم افسانہ ہے، زندگی کا راز موت میں پوشیدہ ہے اور اس نے نیستی کو ہستی اور ہستی کو نیستی قرار دیا ہے۔ اور اس خواب و سراب کی دنیا نے زندہ قوم کو مفلوج کر دیا۔ لہٰذا یہ مسلک علامہ اقبال کے لئے ہر گز قابل قبول نہ تھا، جیسا کہ وہ اسرار خودی میں فرماتے ہیں کہ۔

گفت سِرّ زندگی در مُردن است
شمع را صد جلوه از افسردن است

بر تخیلہای ما فرمان رواست
جام او خواب آور و گیتی رباست(۱۰)

ترجمہ: اس (افلاطون) نے کہا کہ زندگی کا راز مرنے میں ہے۔ شمع میں سینکڑوں جلوے اس کے بجھنے میں ہیں۔ ہمارے تخیلات پر وہ حاوی ہے۔ اس کا جام فکر سلانے والا اور زندگی چھین لینے والا ہے۔

فکر افلاطون زیان را سود گفت
حکمت او بود را نا بود گفت(۱۰)

ترجمہ: افلاطون کی فکر نے نقصان کو نفع کہاہے، اس کی حکمت نے ہونے کو نہ ہونا قرار دیا ہے یعنی ہستی کو نیستی کہا ہے۔

بلکہ اقبال کے نزدیک خودی سے بیداری جنم لیتی ہے اسی میں عمر جاوید اس کا سراغ خودی میں پنہاں ہے اور اسی کے سوز سے امت کا چراغ روشن ہے۔

علامہ اقبال کی نظر میں زندگی تخلیق آرزو اور پھر تکمیل آرزو کا نام ہے۔ اسی سے زندگی میں حسن و بہار ہے۔ بلکہ ہر شے کی فطرت آرزو ہی کی امین ہے اور یہی خودی کے ہنگامے کو زینت دیتی ہے اور علامہ اقبال تو خودی کو سمندر کی ایک بیقرار موج کے نام سے تعبیر کرتے ہیں کہ پھر یہی آرزو مقاصد کے شکار کو پھانسنے والی کمند ہے۔ یوں تخلیق مقاصد اور ان کے حصول کے لیے کی گئی جد و جہد ہی کی بدولت کسی قوم کی بقا ممکن ہے۔ گویا مقاصد آفرینی میں یہ زندگی کا حسن باقی ہے۔ اسی کے دم سے زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ کہتے ہیں کہ

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است(۱۱)

ترجمہ: زندگی جستجو میں پوشیدہ ہے۔ اس کی اصل آرزو میں پوشیدہ ہے۔

آرزو جان جہان رنگ و بوست
فطرت ہر شی امین آرزوست
از تمنا رقص دل در سینہ ھا
سینہ ھا از تاب او آئینہ ھا(۱۱)

ترجمہ: آرزو اس جہان رنگ و بو کی جان ہے۔ ہر چیز کی فطرت آرزو کی امین ہے۔ تمنا کی وجہ سے سینوں میں دل رقص کناں ہیں۔ اور اس کی چمک سے سینے آئینے بنے ہوئے ہیں۔

بلکہ اقبال تو اس بات کی تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ؛

گماں مبر کہ بپایان رسید کار مغاں
ہزار بادۂ نا خوردہ در رگ تاک است (۱۲)

ترجمہ: مت سوچ کہ کار مغان ختم ہو چکا ہے۔ ابھی تو ہزاروں نہ پی ہوئی شرابیں انگور کی بیل میں ہیں۔

ابھی کام ختم نہیں ہوا نجانے رگ تاک میں کتنی بادہ ءناخوردہ پنہاں ہیں اور اس کی کشید کا عمل کب تک یہاں جاری رہے۔ زندگی مسلسل تغیر کا نام ہے۔ ثبات کا ذکر نہیں تخلیق اور ارتقا کا عمل جاری وساری ہے اور رہے گا۔ لہٰذا آرزوؤں کی تکمیل اور مقاصد کے حصول کے لیے جہد مسلسل لازم عمل ہے اور عمل میں مصائب اور ابتلا کا سامنا لازمی عنصر ہے۔ علامہ اقبال نے اسی شعار زندگی کو اپنانے کی تلقین کی ہے اور خود بھی اسی کے خواہاں ہیں جیسا کہ کہتے ہیں کہ؛

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
با من میا کہ مسلک شبیرم آرزوست(۱۳)

ترجمہ: مجھے تیر اور نیزے اور خنجر اور تلوار کی آرزو ہے۔ میرے ساتھ مت آ کیوں کہ مجھے حضرت شبیرؑ کی سنت پر چلنے کی آرزو ہے۔

علامہ اقبال اب بھی امام حسینؑ کی سی ہستی کے آرزومند ہیں جو اپنے پاک خون سے کوفہ اور شام کے پیاسے صحرا کی آبیاری کرے اور پھر سے ان کو سرسبز و شاداب کردے اور حق کی شان کو روشن کرکے حیات جاوید اں پالے۔

ریگ عراق منتظر، کشت حجاز تشنہ کام
خون حسین باز دہ کوفہ و شام خویش را(۱۴)

ترجمہ: عراق کی ریت منتظر، حجاز کی کھیتی پیاسی ہے۔ پھر سے اپنے کوفہ وشام کو امام حسینؑ کا خون دے۔

دراصل خودی اپنی تکمیل اور استحکام کے لئے غیر سے ٹکراتی ہے اور پھر زندگی اس پیکار و مبارزت سے نکھر کر سامنے آتی ہے۔ پیام مشرق کی ایک نظم کا نام ہی "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" ہے۔ جس میں موجوں سے ٹکرانے اور طوفانوں سے آشنا ہونے کا درس دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ خطرات سے ٹکرانے مصائب جھیلنے سے اپنی قوت کا اندازہ ہوتا ہے وجود میں استقلال پیدا ہوتا ہے اور حیات جاوید اں کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ؛

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوای زندگانے نرم خیز است
بہ دریا غلت و با موجش در آویز
حیات جاودان اندر ستیز است(۱۵)

ترجمہ: ساحل پر اپنی محفل مت سجا۔ یہاں زندگی بہت پرسکون ہے دریا میں کودا ور اس کی موجوں کے ساتھ ٹکرا۔ ہمیشہ رہنے والی زندگی ٹکرانے میں ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اس بارے میں یوں اظہار خیال فرماتے ہیں کہ

> ان کے نزدیک خودی اپنی پختگی سے ہی حیات جاوداں حاصل کرسکتی ہے اور پختگی کا واحد معیار آپ کے نزدیک یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے حالات (حتیٰ کہ موت کے صدمے میں بھی) اپنی بے مثل انفرادیت کو قائم و برقرار رکھ سکے۔(۱۶)

علامہ اقبال ایسی ہی مردانہ وار زندگی کے قائل ہیں۔ اور اگر ایسی خطرات سے ٹکرانے والی مردانہ وار زندگی گذارنے کی ہمت نہیں تو موت بہتر ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک ناموافق دنیا سے نباہ کرنا ایسے ہے جیسے میدان جنگ میں ہتھیار ڈال کر اپنی شکست کو مان لینا ہے۔ اسی لئے اقبال کا مرد مومن زمانے کے مطابق نہیں چلتا بلکہ زمانے کو اپنے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ وہ نامساعد حالات کا بڑی ہمت اور حوصلہ سے مقابلہ کرتا ہے۔ اور اپنی منزل کو پالیتا ہے۔ جیسا کہ اسرار خودی میں یوں بیان کرتے ہیں کہ۔

با جہانِ نا مساعد ساختن
ہست در میداں سپر انداختن
مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاجِ اُو بسازَد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں(۱۷)

ترجمہ: ناموافق زمانے کے ساتھ نبھاؤ کرنا میدان میں ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہے۔ ایک خوددار مرد اپنے کام میں پختہ ہوتا ہے وہ اپنے مزاج کے مطابق زمانے کو ڈھال لیتا ہے۔ اگر اس کے مزاج کے مطابق زمانہ نہ چلے تو وہ آسمان سے بھی جنگ آزما ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک خودی جھکنے سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ سوال کرنا خودی کی شان کے خلاف ہے۔ کسی کے آگے دست دراز کرنے سے انسان کی عزت نفس پر حرف آتا ہے بلکہ شخصیت بری طرح مجروح ہو جاتی ہے اور اس سے انسانی شخصیت کی نشوونما پر نہ صرف برا اثر پڑتا ہے بلکہ توازن قائم نہیں رہتا اور ذہنی صلاحیت اعلیٰ فکر کی تخلیق سے محروم ہو جاتی ہے۔ دراصل کسی کے احسان تلے دب جانے سے پوری شخصیت انحطاط کا شکار ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال اس کی وضاحت کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال پیش کرتے ہیں کہ جب حالت سواری میں آپ کے ہاتھ سے تازیانہ گر گیا تو اس کو اٹھانے کے لیے آپ خود اونٹ سے اترے اور یوں اس معمولی سے کام کے لیے کسی کا احسان لینا گوارا نہ کیا۔

اس کے علاوہ علامہ اقبال نے حیات مبارکہ سے ایک مثال دی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاجت لے کر آیا تو آپ ﷺ نے محنت کر کے کمانے پر زور دیا تاکہ روز قیامت بھکاری کے نشان سے نجات پا سکے۔ فرماتے ہیں کہ:

تا نباشی پیش پیغمبر خجل
روز فردائی کہ باشد جان گسل(۱۸)

ترجمہ: تاکہ تجھے آنے والے دن، جو جان کو پگھلا دینے والا ہو گا، پیغمبر اسلام ﷺ کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

آنکہ خاشاک بتان از کعبہ رفت
مرد کاسب را "حبیب اللہ" گفت(۱۸)

ترجمہ: وہ ہستی کہ جس نے بتوں کے کوڑے کرکٹ کو کعبہ سے صاف کر دیا، نے محنت سے کمانے والے کو اللہ کا دوست کہا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک مفلسی وبدحالی قوم کے لیے لعنت ہے جو قوائے انسانی پر برا اثر ڈالتی ہے۔ ایسی قوم کے افراد فکری اور شعوری سرمایہ سے محروم رہتے ہیں اور یہ معاشی اور سیاسی کمزوری انہیں دوسری اقوام کی غلامی کا تحفہ دیتی ہے جو نہ صرف بلندیءِ فکر بلکہ قومی شناخت تک فراموش کروا دیتی ہے۔ اور پھر قوم جدوجہد کو بالائے طاق رکھ کر کسی کے آگے ہاتھ پھیلا کر خودی اور خودداری کا سودا کر لیتی ہے۔ اس کی وجہ سے اپنی عزت وقدر کھو کو دوسروں کے احسان تلے دب جانا اس کا مقدر بن جاتا ہے اور یوں احسان کرنے والا احسان مند کو اپنی مرضی کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

وای بر منت پذیر خوان غیر
گردنش خم گشتہ ی احسان غیر

خویش را از برق لطف غیر سوخت
با پشیزی مایہ ی غیرت فروخت(۱۹)

ترجمہ: افسوس ہے اس پر جو غیر کے کھانے کا احسان لے تو اس کی گردن غیر کے احسان سے جھک گئی۔ اس نے غیر کے کرم سے اپنی تجلی فکر کو جلا ڈالا اور ایک کوڑی کے بدلے اپنی غیرت کے سرمایہ کو بیچ دیا۔

افسوس ہے اس پر جو غیر کے کھانے کا احسان لے تو اس کی گردن غیر کے احسان سے جھک گئی۔ اس نے غیر کے کرم سے اپنی تجلیءِ فکر کو جلا ڈالا اور ایک کوڑی کے بدلے اپنی غیرت کے سرمایہ کو بیچ دیا۔

علامہ اقبال کے نزدیک جہاں سوال سے کمزوری و کاہلی جنم لیتی ہے وہاں فقر اس کو بھرپور قوت فراہم کرتا ہے اور اس کی تکمیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ علامہ اقبال نے اس کی نئی تعبیر نکالی ہے اور یوں فرمایا ہے "فقر سے میری مراد افلاس اور تنگ دستی نہیں بلکہ استغنا و دولت سے لاپرواہی ہے۔" (20) گویا اقبال کے ہاں فقر غنائے نفس کا نام ہے، فقر دل و نظر کی عفت اور طہارت کا نام ہے۔ اسی فقر کو اپنانے کی تاکید ہے تاکہ خسروی تک رسائی ہو سکے۔ کیونکہ وہ صرف خدا کی ذات کا محتاج ہوتا ہے نہ کہ دنیا کی دولت بلکہ وہ تو کائنات کو تصرف میں لے آتا ہے پھر زمانہ اس کو نہیں وہ زمانے کو چلاتا ہے یہی تو علامہ اقبال کا نظریہ ہے کہ؛

نہ تُو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تُو نہیں جہاں کے لیے

ڈاکٹر ابوسعید نور الدین کے مطابق علامہ اقبال اپنے کلام میں فقر کے لیے عموماً چار الفاظ کا استعمال کرتے ہیں پھر چاروں سے وہ ایک ہی مراد لیتے ہیں وہ یہ ہیں: فقر، قلندری، درویشی، رندی(۲۱)۔ دراصل ان کے نزدیک فقر کی بنیاد مراقبے اور تطہیر نفس کے اُصول پر ہے، جس کی روشن مثال نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ اور جس کی توسیع تسلسل اور کشادگی کا سراغ حضرت علی مرتضیٰؓ کے اعمال میں نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال اس فقر کو حجازی فقر کا نام دیتے ہیں۔ اپنی کتاب ضرب کلیم میں اپنے بیٹے جاوید سے مخاطب ہو کر اسی فقر حجازی کو ڈھونڈنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ؛

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی(۲۲)

یہ فقرِ غیُور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری(۲۲)

اسی حجازی فقر کی ضد رہبانی فقر ہے جو اسلام میں ممنوع ہے۔ بال جبریل کے تین اشعار درج ہیں جو فقر حجازی اور فقر رھبانی کے فرق کو واضح کرتے ہیں کہ؛

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھُلتے ہیں اسرارِ جہاں گیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیّری، اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی، سرمایہ شبیریؑ(۲۳)

بلاشبہ یہی وہ دگرگوں حالات تھے، جن سے ماضی میں مسلمانانِ ہند دوچار ہوئے۔ وہ شاندار عظمت رفتہ اور قومی شناخت کو فراموش کر بیٹھے اور پھر طوق گراں بار غلامی ان کا مقدر بنی۔ اس لئے علامہ اقبال کے نزدیک سوال یا دست طلب دراز کرنا ایک لعنت ہے۔ اسرار خودی میں اسی عنوان کے تحت یوں فرماتے ہیں کہ؛

تا بکے دریوزۂ منصب کنی
صورت طفلان ز نی مرکب کنی
فطرتی کو بر فلک بندد نظر
پست می گردد ز احسان دگر
از سوال آشفتہ اجزای خودی
بی تجلی نخل سینا ی خودی
از سؤال، افلاس گردد خوار تر
از گدائے گدیہ گر نادار تر(۲۴)

ترجمہ: تو کب تک مرتبہ (عہدہ) کی بھیک مانگتا رہے گا؟ بچوں کی طرح بانس کے ڈنڈے پر سواری کرتا رہے گا۔ فطرت جو کہ آسمان پر نظر باندھتی ہے کسی دوسرے کے احسان سے پست ہو جاتی ہے۔ سوال سے خودی کے اجزا بکھر جاتے ہیں۔ خودی کا نخل سینا تجلی سے محروم ہو جاتا ہے۔ سوال کرنے سے غریبی اور خوار ہو جاتی ہے۔ بھیک مانگنے سے فقیری زیادہ نادار ہو جاتی ہے۔ مراد بھیک مانگنے سے مفلسی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اور اردو میں یوں فرماتے ہیں؛

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تُو جھکا جب غیر کے آگے، نہ من تیرا نہ تن (۲۵)

جبکہ عشق و محبت سے خودی استحکام پزیر ہوتی ہے اور یہ جاوداں، زیادہ زندہ، زیادہ درخشندہ و تابندہ ہو جاتی ہے۔ خودی قوت عشق سے باطل قوتوں سے ٹکرا کر اپنے لیے حیات ابدی کا سامان پیدا کر لیتی ہے۔ کیونکہ عشق کی بنیاد عناصر اربعہ پر نہیں، عشق کار انبیاءؑ ہے، اور یوں اس کا تعلق عالم ملکوتی ہے۔ جہاں حق سے وابستگی اس کو سراپا حق بنا دیتا ہے۔ علامہ اقبال کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے؛

فطرت او آتش اندوزد ز عشق
عالم افروزی بیاموزد ز عشق(۲۶)

ترجمہ: اس کی فطرت عشق سے حرارت جمع کرتی ہے۔ عشق سے وہ عالم کو روشن کرنا سیکھتی ہے۔

از نگاہ عشق خارا شق بود
عشق حق آخر سراپا حق بود(۲۶)

ترجمہ: عشق کی نگاہ سے پتھر ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ آخر کار عشق سراپا حق ہو جاتا ہے۔

اس لیے کہ خودی کے اندر بے شمار ممکنات پوشیدہ ہیں خودی ہر لمحہ ارتقا کے عمل سے دوچار ہے۔ مثلاً آسمان پر ستاروں کی تصویریں دراصل ستارے نہیں بلکہ یہ تو خودی کی شاخ سے کلیاں پھوٹی ہیں۔ اور کلی کا شاخ سے پھوٹنا بھی خودی کا اظہار ہے۔ علامہ اقبال نے خودی کی تربیت کے لیے باقاعدہ ایک لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے خود فرماتے ہیں کہ؛ "اگر خودی کی تربیت نہ ہوئی تو کہنا یہ چاہیے کہ اس کا مستقبل مخدوش ہے، یہ نہیں کہ ایسی خودی کسی کمتر خودی میں منتقل ہو جائے بلکہ ڈر ہے کہ فنا ہو جائے۔"(۲۷)

دراصل یہ تربیت خلیفہ اللہ کے لئے ہے جسے علامہ اقبال قائم بامر اللہ کا خطاب دیتے ہیں یہ ایک ایسا لائحہ عمل ہے جو مختلف مراحل پر مشتمل ہے اور حقیقت میں یہی شخصیت کے نکھار کا حل ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان خلیفہ اللہ کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر اسرار خودی میں اس طرح سے درج ہے: تربیت خودی کے تین مراحل ہیں۔ پہلا اطاعت، اس مرحلے میں اونٹ کو اطاعت کا مظہر قرار دیا ہے کہ اپنے فرائض کو اونٹ کی مانند بسر و چشم ادا کرنا ہی اطاعت ہے اور سارا نظام کائنات آئین کی پاسداری پر گامزن ہے۔ وہ شریعت کو نقرئی زنجیر سے تشبیہ دے کر پاؤں کی زینت بنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اعلیٰ اور سچی حریت، اطاعت سے ہی جنم لیتی ہے۔ کہتے ہیں کہ؛

باز اے آزاد دستور قدیم
زینت پا کن ھمان زنجیر سیم
شکوہ سنج سختی آئین مشو
از حدود مصطفی ﷺ بیرون مرو(۲۸)

ترجمہ: اے پرانے آئین سے لاتعلق لوٹ آ۔ وہی چاندی کی زنجیر پاؤں میں ڈال لے۔ آئین (شریعت) کی سختی کا گلہ شکوہ نہ کر۔ نبی کریم ﷺ کی شریعت سے باہر نہ نکل۔

دوسرا ضبط نفس: اطاعت سے ضبط نفس پیدا ہوتا ہے اور وہ احکام الٰہی کی پابندی، نفس کو قابو میں کرنے سے آتی ہے۔ علامہ اقبال اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ انسان تو بھی اپنے نفس کی لگام کو تھام لے اس طرح تو ہر قسم کی آلودگیوں سے مبرا ہو جائے گا اس نفس کو قابو کر کے ایک کے آگے جھکنے کا عادی بنالے جو پھر ہر کس و ناکس کی غلامی سے آزاد ہو گا۔ اور لا الہ کی لامحدود طاقت کی بنا پر اکیلا ہونے کے باوجود ایک لشکر کی مانند ہو گا۔

جب کہ نماز مسلمان کے ہاتھ میں مثال خنجر اور روزہ بھوک اور پیاس پر شبخون مارتا ہے۔ اور حج جغرافیائی حدود کا فرق ختم کر کے ملت کی جمعیت کا حامل جبکہ زکوٰۃ مال و دولت کی ہوس سے آزادی کا درس دیتی ہے۔ گویا یہ تمام ارکان اسلام انسان کی قوت و مضبوطی کا سامان فراہم کرنے کا باعث ہیں تاکہ نفس کی

تربیت ہو سکے۔ علامہ اقبال کے نزدیک ضبط نفس دراصل واجبات کی ادائیگی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اور پھر اپنے نفس پر حکمرانی سے جرات واستقلال اور حقیقی آزادی کی راہیں کھلتی ہیں۔ اسی بات کی تلقین وہ مسلم قوم کو کرتے ہیں کہ؛

مرد شو آور زمام او بکف
تا شوی گوہر اگر باشی خزف
ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرمان پذیر از دیگراں(۲۹)

ترجمہ: مرد بن اور اس (نفس) کی لگام کو ہاتھ میں تھام لے، تاکہ اگر تو کھوٹی کوڑی ہے تو تو گوہر بن جائے۔ جو اپنے اوپر حکم نہیں چلاتا، اسے دوسروں کی حکم برداری کرنی پڑتی ہے۔

این ہمہ اسباب استحکام تست
پختہ ی محکم اگر اسلام تست
اہل قوت شو ز ورد یا قوی
تا سوار اشتر خاکی شوی(۳۰)

ترجمہ: یہ سب (ارکان اسلام) تیری پختگی کا سامان ہے اگر تیرا اسلام مضبوط ہے، تو بھی مضبوط ہے۔ یا قوی کے ورد سے طاقتور بن جا۔ تاکہ تو مٹی کے اونٹ (نفس) پر سوار ہو سکے۔

ضبط نفس یقیناً انسان کی قوت کا مظہر ہے۔ یوں صاحب عزم وہمت بن کر نفسانی خواہشات ومفادات سے بالاتر ہو تسخیر کائنات کرتے ہوئے تاج سلیمانی سے مزین ہو جاتا ہے اور یہی خودی کا تیسرا اور حسین مرحلہ "نیابت الٰہی" ہے۔ پھر وہ خدائے بزرگ وبرتر کا نائب اور دنیا کی روح رواں بن جاتا ہے۔ اس کا وجود کائنات کے وجود کی دلیل ہوتا ہے اور اس کے اعجاز عمل سے انسانی معاشرے اور ملت میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ پہاڑ اسکی ہیبت سے لرزاں اور دریا خشک لیکن، لالہ کے دامن میں ٹھنڈک کا احساس جنم لیتا ہے۔ اور اس کا انقلاب قوم میں ہدایت وصفا اور امن وآشتی کی فضا کو برقرار رکھنے میں مدد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ یہی انسانیت کی معراج ہے۔ اور یہی نائب حق کی عملی تفسیر ہے، جس کی بنا پر انسان اشرف المخلوقات ہے۔

نائب حق درجہان بودن خوش است
بر عناصر حکمران بودن خوش است
نائب حق ہمچو جانِ عالم است
ہستیٔ او ظلِ اسمِ اعظم است(۳۱)

ترجمہ: دنیا میں اللہ تعالیٰ کا جانشین بننا اچھی بات ہے۔ عناصر پر حکمرانی کرنا اچھا ہے۔ اللہ کا جانشین دنیا کی روح کی مانند ہوتا ہے۔ اس کا وجود اس اعظم کا سایہ ہوتا ہے۔

زندگی را می کند تفسیر نو
می دہد این خواب را تعبیر نو

ہستیٔ مکنون او راز حیات
نغمۂ نشنیدۂ ساز حیات(۳۲)

ترجمہ: وہ زندگی کی نئی تفسیر کرتا ہے۔وہ اس خواب کو نءی تعبیر دیتا ہے۔اس کی پوشیدہ ہستی، زندگی کا راز ہوتی ہے وہ زندگی کے ساز کا ایسا نغمہ ہوتا ہے جو کبھی سنا نہ گیا ہو۔

گویا وہ ساری کائنات پر چھا جاتا ہے۔ اور پھر کار کشائی، کار آفرینی اور کار سازی کی خدائی صفات اس کی ذات میں آجاتی ہیں، اور اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔علامہ کے نزدیک یہ باتیں عام انسان کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ در اصل جو بھی اپنی ذات پر غالب آجائے یا اپنے نفس کو قابو کرلے، وہ مرد آہن بن جاتا ہے، اور پھر شکوہ خیبر اس کے قدموں تلے آجاتا ہے۔ یہاں پر علامہ حضرت علی مرتضیٰؑ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

مرتضیٰ کز تیغ او حق روشن است
بوتراب از فتح اقلیم تن است
مرد کشور گیر از کراری است
گوہرش را آبرو خودداری است
ہر کہ در آفاق گردد بوتراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب
ہر کہ زین بر مرکب تن تنگ بست
چون نگین بر خاتم دولت نشست(۳۳)

ترجمہ: مرتضیٰ جن کی تلوار سے سچائی دنیا میں روشن ہوئی، انہوں نے بدن کی ولایت پر فتح پانے کے باعث بو تراب کا لقب پایا۔ بہادر آدمی کراری کی وجہ سے فاتح ملک بن جاتا ہے، اس کے گوہر کی آب و تاب خودداری کی وجہ سے ہے۔ جو کوئی اس کائنات میں ابو تراب بنتا ہے، پھر وہ مغرب سے سورج کو پلٹا دیتا ہے ۔ جس نے بھی تن کی سواری پر مضبوطی سے زین باندھ لی، پھر وہ حکومت کی مہر میں نگینے کی طرح بیٹھ گیا۔

علامہ اقبال کے نزدیک یہ تمام کمالات بیداری خودی کی مرہون منت ہیں۔ یقیناً ساری کائنات خودی کی جولان گاہ ہے۔ اور صاحب خودی "خالد جانباز ہے یا حیدر کرار" پھر محض جسمانی یا روحانی استعداد کی بات نہیں ہوتی بلکہ تمام معنوی اور عقلی صلاحیتیں پیش نظر ہوتی ہیں جو کائنات میں انسانی برتری کو واضح کرتی ہیں جس کا علامہ اقبال یوں ذکر کرتے ہیں کہ؛

آیۂ تسخیر اندر شأن کیست؟
این سپہر نیلگون حیران کیست؟
رازدان علم الاسما کہ بود
مست آن ساقی و آن صہبا کہ بود(۳۴)

ترجمہ: آیہ تسخیر کس کی شان میں ہے؟۔ نیلا آسمان کس کی عظمت پر حیران ہے۔ علم الاسما کا رازداں کون تھا؟ اس ساقی اور شراب کا مست کون تھا۔ یعنی تو ہی ہے۔

یہی وہ مقام اعلیٰ ہے جہاں شناخت نفس کے بعد معرفت الٰہی کی منزل آتی ہے اور پھر انسان حضرت علی مرتضیٰؓ کے حکمت بھرے قول ”من عرف نفسہ فقد عرف ربہ“ کی عملی تفسیر بن جاتا ہے۔ کیونکہ حقیقت خداوندی کو سمجھنے کے لیے اپنی ذات کی حقیقت کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ دراصل خود شناسی میں خداشناسی کے ساتھ ساتھ نظام کائنات کا ادراک ہوتا ہے اور یہی عرفان ذات کا مطمعء نظر ہے جیسا کہ جاوید نامہ میں، غزل زندہ رود، کے عنوان سے درج ہے، اس میں فرماتے ہیں کہ؛

بآدمی نرسیدی، خدا چہ می جوئی
ز خود گریختہ ئی آشنا چہ می جوئی!
دگر بشاخ گل آویز و آب و نم در کش
پریدہ رنگ! ز باد صبا چہ می جوئی؟(۳۵)

ترجمہ: تو آدمی تک تو پہنچا نہیں، خدا کو کیا ڈھونڈتا ہے تو خود سے بھاگا ہوا ہے آشنا کو کیا تلاش کرتا ہے۔ پھر پھول کی شاخ سے لٹک جا اور پانی اور نمی کھینچ لے۔ اے اڑے ہوئے رنگ والے (پھول)! تو باد صبا سے کیا تلاش کرتا ہے؟

اس دور میں جب مسلمان اپنی قومی شناخت بلکہ شخصیت کا ادراک تک فراموش کر چکے تھے، تو ایسے میں علامہ اقبال جیسی صاحب بصیرت ہستی بر صغیر کے مسلمانوں کی حالت زار پر کڑی نظر رکھتے ہوئے، اس دور کے تقاضوں کے مطابق قوم کی حس ملی کو بیدار کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور پیام شناخت یعنی درس خودی دیا۔ بلاشبہ خودی کے عارف کا مقام اعلیٰ وارفع ہے جس کا اظہار اس طرح کیا کہ؛

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صُبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رُوسیاہی(۳۶)

حاصل کلام

علامہ اقبال کے مکتبہ فکر میں خودی ہی نہ صرف کسی فرد کی تعمیر و ترقی کی ضامن بلکہ یہ جوہر لازوال قوم و ملت کے عروج کا باعث ہے۔ جب کوئی فرد یا ملت اپنی شناخت کر لیتی ہے تو وہ کسی دوسرے کے دست نگر نہیں بلکہ اپنے زور بازو پر کامل یقین رکھتے ہوئے بڑے بڑے خطرات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کر لیتی ہے، تو پھر پہاڑ اس کی ہیبت سے دو نیم اور صحرا اس کی دہشت سمٹ جاتے ہیں، اور وہ جگر لالہ میں شبنم کے قطرے کی مثل قوم کی شادابی کا باعث بنتا ہے۔ اور پھر دست خدا بن کر قوم و ملت کے لئے کارہائے نمایاں سر انجام دیتا۔

درحقیقت، یہی وہ منزل ہے جہاں خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے کی عملی تفسیر بن جاتا ہے۔ یہی علامہ اقبال کا دلنشیں پیام خودی ہے. جو عین عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ وگرنہ اگر خودشناسی نہیں اور اپنی ذات کا ادراک نہیں تو پھر انسان ایک بے روح لاشہ کی مانند ہے جہاں غلامی ہی غلامی ہے، نہ مردانگی ہے اور نہ ہی آزادی کی نعمت، جو صدیوں کی جہد مسلسل کے بعد اور لاتعداد قربانیوں کے نتیجے میں ملی ہے اور بہت اہم بات یہ ہے کہ اب اس کی حفاظت درکار ہے جو سب کا قومی فریضہ ہے۔

مسلماں از خودی مرد تمام است
بخاکش تا خودی میرد غلام است
اگر خود را متاع خویش دانی
نگہ را جز بخود بستن حرام است(۳۷)

ترجمہ: خودی کی وجہ سے مسلمان ایک مکمل مرد ہے۔ جب اس کی مٹی (وجود) سے خودی مر جاتی ہے تو وہ غلام ہے۔ اگر تو اپنے سرمایہ کو جان لے تو اپنے سوا کسی پر نظر رکھنا حرام ہے۔

آج وقت کا اہم تقاضا یہ ہے کہ اس پر آشوب دور میں پھر سے فکر اقبال سے شمع روشن کی جائے۔ تاکہ نوجوان نسل قیام پاکستان کی اصل روح کا شعور رکھتے ہوئے اس کی پاسبانی کی اہم ذمہ داری کو عہدہ براہو سکیں۔ کیونکہ کسی فرد، معاشرے اور قوم میں آگہی سے بڑھ کر کوئی بڑی نعمت نہیں۔ یہی بیداری کا سبب بنتی ہے، یہی خود شناسی انسان کی نشو نما میں کلیدی کردار کی حامل ہے۔ جو مقام آرزو سے ہوتے ہوئے منزل مقصود کی نشاندہی کرتی ہے۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر(۳۸)

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر!(۳۸)

نسل نو جس سے علامہ اقبال کو بڑی توقعات ہیں اس لیے کہ شباب نام ہی گرم لہو کا ہے جہاں ولولہ جوش اور کچھ کرنے کی امنگ ہوتی ہے یہی جوان کسی ملک وملت کے مقدر کا ستارہ بن کر اس کو اوج ثریا تک لے جانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اقبال ان میں چشم بصیرت پیدا کرنے کی جد وجہد میں ہیں تاکہ یہ خویشتن دار، خویشتن باز و خویشتن ساز کا فلسفہ خودی اختیار کریں تاکہ شخصیت میں نکھار پیدا ہو سکے کیونکہ جب شخصیت میں استحکام آجاتا ہے تو پھر فنا نہیں بقا ہی بقا ہے۔ کہیں علامہ اقبال کا پیام دلنشیں ہے، جس کو عصر حاضر میں پھیلانے اور اپنانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ مشکلات و خطرات سے بطریق احسن نبرد آزما ہوا جا سکے، اور نہ صرف اپنی ذات بلکہ ملک و قوم کی سلامتی اور ترقی میں اہم کردار ادا ہو سکے۔

حوالہ جات

۱۔ اقبال، ارمغان حجاز، ص۱۰۹
۲۔ جاوید اقبال (مرتبہ) افتخار صدیقی (مترجمہ) شذرات فکر اقبال، ص۶۷
۳۔ شاہد حسن رضوی (مرتبہ) مجلہ الزبیر اور اقبال شناسی کی روایت، ص۱۴۴
۴۔ اقبال، دیباچہ اسرار خودی، مشمولہ مضامین اقبال، ص۴۸
۵۔ اقبال، جاوید نامہ، ص۴۶
۶۔ اقبال، اسرار خودی، ص۲۱
۷۔ اقبال، بال جبریل، ص۸۳
۸۔ اقبال، اسرار خودی، ص۱۸
۹۔ اقبال بانگ درا (طلوع اسلام)
۱۰۔ اقبال، اسرار خودی، ص۳۲۔۳۳

١١۔ ھمان، ص١٦۔١٥

١٢۔ اقبال، پیام مشرق، ص٩٤

١٣۔ اقبال، پیام مشرق، ص١٥٦

١٤۔ اقبال، زبور عجم، ص١١

١٥۔ اقبال، پیام مشرق، ص٤٥

١٦۔ سید عبداللہ (مرتبہ) متعلقات خطبات اقبال، ص192

١٧۔ اقبال، اسرار خودی، ص٤٩

١٨۔ ایضاً، ص٢٤

١٩۔ ایضاً

٢٠۔ محمود نظامی (مرتبہ) ملفوظات اقبال، ص٢٢٩

٢١۔ اَبو سعید نورالدین، اسلامی تصوف اور اقبال، ص٣٤٨

٢٢۔ اقبال، ضرب کلیم، ص٨٨

٢٣۔ اقبال، بال جبریل، ص١٦٠

٢٤۔ اقبال، اسرار خودی، ص٢٣

٢٥۔ اقبال، بال جبریل، ص٣١

٢٦۔ اقبال، اسرار خودی، ص١٨

٢٧۔ سید نزیر نیازی، اقبال کے حضور، ص٨٦

٢٨۔ اقبال، اسرار خودی، ص٤١

٢٩۔ اقبال، اسرار خودی، ص٤٢

٣٠۔ ایضاً، ص٤٣

٣١۔ ایضاًص٤٤

٣٢۔ ایضاً، ص٤٥

٣٣۔ ایضاً، ص٤٨

٣٤۔ اقبال، جاوید نامہ، ص٨

٣٥۔ ایضاً، ص١٨٧

٣٦۔ اقبال، بال جبریل، ص٥٤

٣٧۔ اقبال، ارمغان حجاز، ص٦٧

٣٨۔ اقبال، بال جبریل، ص١٦٠

منابع وماخذ

اقبال، اسرار ورموز، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ١٩٨٤ء

اقبال، پیام مشرق، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ١٩٨٦ء

اقبال، جاوید نامہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ١٩٨٦

اقبال، ارمغان حجاز، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ١٩٨٦ء

اقبال، بانگ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

اقبال، بال جبریل، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۸۷

اقبال، ضرب کلیم، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ترجمہ خطبات اقبال از سید نذیر نیازی، بزم اقبال لاہور، ۲۰۰۰ء

اقبال، مقالات اقبال، مرتبہ سید عبد الواحد معینی و محمد عبد اللہ قریشی، آئینہ ادب لاھور، ۱۹۸۲ء

اقبال، کلیاتِ اقبال، اقبال اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۳ء

آبو سعید نورالدین، اسلامی تصوف اور اقبال، اقبال اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۷

اسلم انصاری، اقبال عہد آفرین، کاروان ادب ملتان، بار اوّل ۱۹۸۷ء

افتخار صدیقی (مترجمہ) شذرات فکر اقبال، مرتبہ جاوید اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور طبع دوم ۱۹۸۸ء

رحیم بخش شاہین، تسہیل خطبات اقبال، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی لاہور, ۱۹۹۲ء

سید محمد اکرم، اقبال وجہان فارسی، شعبہ اقبالیات، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۹۹

سید عبد اللہ (مرتبہ) متعلقات خطبات اقبال مرتبہ سید عبد اللہ۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۷۷ء

سید نزیر نیازی، اقبال کے حضور، اقبال اکیڈمی کراچی، س ن

شاہد حسن رضوی (مرتبہ) مجلہ الزبیر اور اقبال شناسی کی روایت، اردو اکیڈمی لاہور، ۲۰۲۰ء

عبد الشکور احن، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، اقبال اکیڈمی پاکستان، طبع اوّل، ۱۹۷۷ء

عبد الواحد معینی مرتبہ مقالات اقبال، بار دوم، ۱۹۸۲ء

محمود نظامی (مرتبہ) ملفوظات اقبال، طبع اول، س ن